

PD – September 2025

اجتماعی مطالعہ قرآن - ستمبر ۲۰۲۵

سورہ المائدہ۔۔۔ آیت ۲

آیت۔۔۔ ۲

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا
أَمِينَ الْبَيْتِ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا وَلَا
يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ أَن صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَن تَعْتَدُوا وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ
وَالْتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو۔۔۔۔۔⁵ نہ حرام مہینوں میں سے کسی کو حلال کر لو، نہ قربانی کے جانوروں پر دست درازی کرو، نہ اُن جانوروں پر ہاتھ ڈالو جن کی گردنوں میں نذر خداوندی کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوئے ہوں، نہ اُن لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکانِ محترم (کعبہ) کی طرف جارہے ہوں۔⁶ ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو شکار تم کر سکتے ہو۔۔۔۔۔⁷ اور دیکھو، ایک گروہ نے جو تمہارے لیے مسجدِ حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلہ میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو۔⁸ نہیں! جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اس کی سزا بہت سخت ہے۔

تفسیر تفہیم القرآن۔ مولانا مودودی

سُورَةُ الْمَائِدَةِ حَاشِيَةُ نَمْرِ: 5

ہر وہ چیز جو کسی مسلک یا عقیدے یا طرزِ فکر و عمل یا کسی نظام کی نمائندگی کرتی ہو وہ اس کا ”شعار“ کہلائے گی، کیونکہ وہ اس کے لیے علامت یا نشانی کا کام دیتی ہے۔ سرکاری جھنڈے، فوج اور پولیس وغیرہ کے یونیفارم، سکے، نوٹ اور اسٹامپ حکومتوں کے شعائر ہیں اور وہ اپنے محکموں سے، بلکہ جن جن پر ان کا زور چلے، سب سے ان کے احترام کا مطالبہ کرتی ہیں۔ گرجا اور قربان گاہ اور صلیب مسیحیت کے شعائر ہیں۔ چوٹی اور زئثار اور مندر برہمنیت کے شعائر ہیں۔ کیس اور کڑا اور کرپان وغیرہ سکھ مذہب کے شعائر ہیں۔ ہتھوڑا اور درانتی اشتر اکیٹ کا شعار ہیں۔ سواستیکا آریہ نسل پرستی کا شعار ہے۔ یہ سب مسلک اپنے اپنے پیروں سے اپنے ان شعائر کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی نظام کے شعائر میں سے کسی شعار کی توہین کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ دراصل اُس نظام کے خلاف دشمنی رکھتا ہے، اور اگر وہ توہین کرنے والا خود اسی نظام سے تعلق رکھتا ہو تو اس کا یہ فعل اپنے نظام سے ارتداد اور بغاوت کا ہم معنی ہے۔

”شعائر اللہ“ سے مراد وہ تمام علامات یا نشانیاں ہیں جو شرک و کفر اور دہریت کے بالمقابل خالص خدا پرستی کے مسلک کی نمائندگی کرتی ہوں۔ ایسی علامات جہاں جس مسلک اور جس نظام میں بھی پائی جائیں مسلمان ان کے احترام پر مامور ہیں، بشرطیکہ ان کا نفسیاتی پس منظر خالص خدا پرستانہ ہو، کسی مشرکانہ یا کافرانہ تخیل کی آلودگی سے انہیں ناپاک نہ کر دیا گیا ہو۔ کوئی شخص خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اگر اپنے عقیدہ و عمل میں خدائے واحد کی بندگی و عبادت کا کوئی جُزء رکھتا ہے، تو اس جُزء کی حد تک مسلمان اس سے موافقت کریں گے اور ان شعائر کا بھی پورا احترام کریں گے جو اس کے مذہب میں خالص خدا پرستی کی علامت ہوں۔ اس چیز میں ہمارے اور اس کے درمیان نزاع نہیں بلکہ موافقت ہے۔ نزاع اگر ہے تو اس افر میں نہیں کہ وہ خدا کی بندگی کیوں کرتا ہے، بلکہ اس امر میں ہے کہ وہ خدا کی بندگی کے ساتھ دوسری بندگیوں کی آمیزش کیوں کرتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ شعائر اللہ کے احترام کی یہ حکم اُس زمانہ میں دیا گیا تھا جبکہ مسلمانوں اور مشرکین عرب کے درمیان جنگ برپا تھی، مکہ پر مشرکین قابض تھے، عرب کے ہر حصے سے مشرک قبائل کے لوگ حج و زیارت کے لیے کعبہ کی طرف جاتے تھے اور بہت سے قبیلوں کے راستے مسلمانوں کی زد میں تھے۔ اس وقت حکم دیا گیا کہ یہ لوگ مشرک ہی سہی، تمہارے اور ان کے درمیان جنگ ہی سہی، مگر جب یہ خدا کے گھر کی طرف جاتے ہیں تو انہیں نہ چھیڑو، حج کے مہینوں میں ان پر حملہ نہ کرو، خدا کے دربار میں نذر کرنے کے لیے جانور یہ لیے جارہے ہوں اُن پر ہاتھ نہ ڈالو، کیونکہ ان کے بگڑے ہوئے مذہب میں خدا پرستی کا جتنا حصہ باقی ہے وہ بجائے خود احترام کا مستحق ہے نہ کہ بے احترامی کا۔

اللہ کی رستی سے مراد اس کا دین ہے، اور اس کو رستی سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہل ایمان کا تعلق اللہ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔ اس رستی کو ”مضبوط پکڑنے“ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اصل اہمیت ”دین“ کی ہو، اسی سے ان کو دلچسپی ہو، اسی کی اقامت میں وہ کوشاں رہیں اور اسی کی خدمت کے لیے آپس میں تعاون کرتے رہیں۔ جہاں دین کی اساسی تعلیمات اور اس کی اقامت کے نصب العین سے مسلمان ہٹے اور ان کی توجہات اور دلچسپیاں جزئیات و فروع کی طرف منحرف ہوئیں، پھر ان میں لازماً وہی تفرقہ و اختلاف رونما ہو جائے گا جو اس سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی امتوں کو ان کے اصل مقصد حیات سے منحرف کر کے دنیا اور آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا کر چکا ہے۔

سُورَةُ النَّبَاِ حَاشِيَةُ نَمبر: 6

”شعائر اللہ“ کے احترام کا عام حکم دینے کے بعد چند شعائر کا نام لے کر ان کے احترام کا خاص طور پر حکم دیا گیا کیونکہ اُس وقت جنگی حالات کی وجہ سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ جنگ کے جوش میں کہیں مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی توہین نہ ہو جائے۔ ان چند شعائر کو نام بنام بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ صرف یہی احترام کے مستحق ہیں۔

سُورَةُ النَّبَاِ حَاشِيَةُ نَمبر: 7

احرام بھی من جملہ شعائر اللہ ہے، اور اس کی پابندیوں میں سے کسی پابندی کو توڑنا اس کی بے حرمتی کرنا ہے۔ اس لیے شعائر اللہ ہی کے سلسلہ میں اس کا ذکر بھی کر دیا گیا کہ جب تک تم احرام بند ہو، شکار کرنا خدا پرستی کے شعائر میں سے ایک شعار کی توہین کرنا ہے۔ البتہ جب شرعی قاعدہ کے مطابق احرام کی حد ختم ہو جائے تو شکار کرنے کی اجازت ہے۔

سُورَةُ النَّبَاِ حَاشِيَةُ نَمبر: 8

چونکہ کفار نے اس وقت مسلمانوں کو کعبہ کی زیارت سے روک دیا تھا اور عرب کے قدیم دستور کے خلاف حج تک سے مسلمان محروم کر دیے گئے تھے، اس لیے مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جن کافر قبیلوں کے راستے اسلامی مقبوضات کے قریب سے گزرتے ہیں، ان کو ہم بھی حج سے روک دیں اور زمانہ حج میں ان کے قافلوں پر چھاپے مارنے شروع کر دیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر انہیں اس ارادہ سے باز رکھا۔

تفسیر تدر القرآن۔۔۔ مولانا امین احسن اصلاحی

شعائر کا احترام: لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ، بقرہ آیت 158 کے تحت 'شعائر اللہ' پر تفصیل کے ساتھ بحث ہو چکی ہے۔ شعائر کسی اہم دینی و روحانی حقیقت کے مظہر اور پیکر ہیں۔ ان میں اصل مقصود کی حیثیت تو ان روحانی و معنوی حقائق کی ہے جو ان مظاہر کے اندر مضمر ہیں اس لیے کہ ان حقائق ہی کا احساس دلانے کے لیے ان کو بطور نشان اور علامت کے مقرر کیا گیا ہے لیکن یہ مقرر کردہ خدا کے ہیں اس وجہ سے ان کے ظاہر و باطن دونوں کا یکساں احترام مطلوب ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ ان کے احترام کے جو آداب و شرائط مقرر ہیں ان کی خلاف ورزی کرے یا جو چیزیں یا جو باتیں ان کے تعلق سے حرام ہیں ان کو جائز کرے۔ مثلاً چار محترم مہینوں۔ ذی قعدی، ذی الحجہ، محرم اور رجب جو حج و عمرہ کے تعلق سے محترم مہینے قرار دیے گئے ہیں، ان میں لڑائی بھڑائی ممنوع ہے، اگر کوئی گروہ ان میں لڑائی چھیڑ دے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے ان حرام مہینوں کو اپنے لیے جائز کر لیا اور ان کی بے حرمتی کی۔

'ہدی' اور 'قلائد' کا مفہوم: 'ہدی' قربانی کے جانوروں کو کہتے ہیں ج بطور ہدیہ خدا کے حضور پیش کرنے کے لیے بیت اللہ لے جاتے ہیں۔ 'قلائد' قلابہ کی جمع ہے جس کے معنی پٹے کے ہیں۔ اس میں مضاف محذوف ہے یعنی ذوات القلائد، یعنی قربانی اور نذر و نیاز کے وہ جانور جن کو تخصیص کے طور پر پٹے باندھ دیے گئے ہیں کہ پہچانے جائیں، کوئی ان سے تعرض نہ کرے۔ 'ہدی' کے بعد 'قلائد' کا ذکر عام کے بعد خاص کے ذکر کی نوعیت رکھتا ہے اور مقصود اس سے تعرض کی سنگینی کو واضح کرنا ہے کہ جن جانوروں کے گلے میں خدا کی تخصیص کے پٹے باندھ گئے ان پر حملہ خاص خدا کے گلے پر حملہ کرنا ہے۔ اسی طرح اَمِّیْنِ الْبَيْتِ الْحَرَامِ کے ساتھ، یَتَتَّعُونَ فُضُلًا مِّنْ دِّبْہِمُ وَرِضْوَانًا، کی صفت کا ذکر اس نہی کو موثر بنانے کے لیے ہے کہ جو اللہ کے بندے خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں گھر سے نکلے ہوں ان کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو نا خود خدا سے تعرض کرنے کے مترادف ہے۔ وَلَا یَجُوزُ مَعُکُمْ شَنَاؤُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْکُمْ۔۔۔ البیۃ، 'شتمان' کے معنی بغض و عداوت کے ہیں اور 'الایجر منکم' کے معنی ہیں، تمہارے لیے سبب و محرک نہ بنے، تمہیں آمادہ نہ کرے۔ 'قوم' سے مراد یہاں قریش ہیں اور 'ان صدوکم عن المسجد الحرام' اس بغض و عداوت کے سبب کی تفصیل ہے۔ یعنی قریش نے تمہیں بیت اللہ سے روک کر ہر چند تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے لیکن اس چیز کا غم و غصہ بھی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم شعائر الہی کے معاملے میں حدود الہی سے تجاوز کرو۔ ان کے عازمین حج کے قافلوں کو یا ان کے نذر و نیاز کے جانوروں کو کوئی گزند نہ پہنچاؤ۔

دوسروں کی انگینت پر حدود الہی سے تجاوز تعاون علی الاثم ہے: وَتَعَاوَنُوا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی۔۔۔ الایۃ، یہ اوپر والی بات ہی کی ایک دوسرے پہلو سے تاکید ہے یعنی جس گروہ کو اللہ نے دنیا میں نیکی اور تقوی قائم کرنے کے لیے پیدا کیا ہے اس کے لیے پسندیدہ روش یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی زیادتیوں سے مشتعل ہو کر خود اسی طرح کی زیادتیاں کرنے لگے۔ وہ ایسا کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے گناہ اور زیادتی کے کام میں تعاون کیا اور شریروں نے برائی کی جو نیو جمائی اس پر اس نے بھی چند روئے رکھ دیے، حالانکہ اس کا کام نیکی اور تقوی میں تعاون کرنا تھا۔

یہ ملحوظ رہے کہ یہاں جس چیز سے روکا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے کے طرز عمل سے مشتعل ہو کر کوئی کام جارحانہ طور پر خود مسلمان بھی ایسا کر گزریں جو شعائر الہی کے احترام کے منافی ہو۔ اگر مسلمانوں کو اپنے تحفظ اور دفاع کے لیے مجبوراً کوئی قدم اٹھانا پڑے تو وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ دفاعی جنگ اشہر حرم بلکہ عین حرم میں بھی لڑی جاسکتی ہے۔ بقرہ میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

اجزا کو سمجھ لینے کے بعدیت کے مجموعی نظام پر ایک بار پھر نظر ڈال لیجیے:

اوپر والی آیت میں حالت احرام میں شکار کی ممانعت فرمائی تھی کہ یہ چیز احرام کے تقدس اور اس کے درویشانی مزاج کے خلاف تیر شعائر الہی میں سے ایک شعیرہ کی توہین ہے۔ اب اسی تعلق سے تمام شعائر الہی کے احترام کی پہلے بحیثیت مجموعی تاکید فرمائی پھر چند مخصوص شعائر کا حوالہ دیا۔ پھر شکار کی ممانعت سے متعلق یہ واضح فرما دیا کہ اس کا تعلق صرف حالت احرام سے ہے۔ احرام سے باہر آجانے کے بعد یہ ممانعت اٹھ جائے گی۔

پھر اس اشتعال انگیز سبب کا ذکر فرمایا جو اس وقت تازہ بتازہ موجود تھا۔ اندیشہ تھا کہ مسلمان اس سے مغلوب ہو کر کوئی ایسی بات کر گزریں جو احترام شعائر کے منافی ہو۔ قریش کے ان کو بیت اللہ کے حج و زیارت سے محروم کر رکھا تھا۔ یہ معاملہ نہایت نازک اور صبر آزما تھا اور اب کہ مسلمانوں نے سیاسی قوت حاصل کر لی تھی خاصاً اندیشہ اس بات کا تھا کہ اس عہد کے احترام میں ان سے کوئی بے اعتدالی صادر ہو جائے۔ یہ صورت حال مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ان کو منزل (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قدم سے ہوشیار کر دے کہ دوسروں کی زیادتیاں بھی ان کے لیے کسی زیادتی کا جواز فراہم نہیں کر سکتیں۔ وہ دنیا میں شعائر الہی کا احترام قائم کرنے اور نیکی اور تقویٰ کے علم بردار بن کر اٹھے ہیں اس وجہ سے جب تک اپنے بچاؤ کی ضرورت مجبور نہ کر دے ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم نیک اور تقویٰ کے خلاف اٹھائیں۔ اس کے بعد نکتے کی بات یہ ارشاد ہوئی کہ دوسروں کے غلط رویے سے متاثر ہو کر انہی کی سی روش اختیار کر لینا درحقیقت ان کی برپا کی ہوئی بدی میں ان کے ساتھ تعاون کرنا ہے، اور یہ چیز اہل ایمان کے شایان شان نہیں ہے۔ اہل ایمان کے شایان شان بات یہ ہے کہ وہ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کریں۔ دشمن کے ہاتھوں بھی کوئی کام نیکی کا ہو رہا ہو تو اس میں مزاحم ہونے کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کریں۔ آخر میں 'شدید العقاب' کا حوالہ دینے سے مقصود مسلمانوں کو سخت الفاظ میں تنبیہ ہے کہ عہد الہی کی حرمت سخت سے سخت حالات میں بھی قائم رکھنی ہے۔ ورنہ یاد رکھو کہ جس خدا نے تم کو اپنے عہد و میثاق سے دنیا کی امامت کی سرفرازی بخشی ہے، اس کے ہاں نقض میثاق کی پاداش بھی بڑی ہی سخت ہے۔

سورہ التوبہ۔۔۔ آیت ۷۲

آیت۔۔۔ ۷۲

وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسْكَنٌ طَيِّبَةٌ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٧٢﴾

ان مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ انہیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان سدا بہار باغوں میں ان کے لیے پاکیزہ قیام گاہیں ہوں گی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انہیں حاصل ہوگی۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ ۹۷

تفسیر فی ظلال القرآن - سید قطب شہید

یہ لوگ ان جنات میں باعز طور پر رہیں گے۔ لیکن ان کے لیے ان اعلیٰ رہائش گاہوں سے بھی بڑا انعام اللہ کی رضامندی ہے اور جنت اپنی تمام آسائشوں کے ساتھ اس بڑے انعام کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔ اور یہ خوشی یعنی رضائے الہی کی خوشی سب سے بڑی خوشی ہے۔

اللہ کے ساتھ رابطے کا اعلیٰ مقام انسان کو اس وقت ملتا ہے کہ جب وہ اللہ اپنی آنکھوں سے نظر آئے یعنی حالت شہود۔ اس مقام میں انسان دنیا کی کثافتوں، اس کی پریشانیوں اور اس کی دلچسپیوں سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس مقام میں انسان کے دل کی گہرائیوں سے ایک روشنی نکلتی ہے۔ انسانی آنکھیں اس نور کو نہیں دیکھ سکتیں اور یہ نور، نور الہی ہوتا ہے اور اس کا تعلق روح اللہ سے ہوتا ہے۔ یہ مقام انسانوں میں سے نہایت ہی قلیل تعداد کو نصیب ہوتا ہے۔ اس مقام کا ایک لحظہ اور ایک چمک ہی پوری زندگی کے مال و متاع سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ جبکہ اللہ کی رضامندی کا مقام تو اس سے بھی بلند مقام ہے اور اس میں انسان کی روح کا پیانہ لبریز ہو جاتا ہے اور انسان تسلسل کے ساتھ اس کا شعور اپنے اندر پاتا ہے۔

تفسیر تیسیر القرآن - مولانا عبدالرحمن کیلانی

[۸۷] اللہ کی خوشنودی سے مراد؟ جنت کی نعمتیں بے شمار، لاتعداد اور لازوال ہیں جن کا ذکر کتاب و سنت میں بہت سے مقامات پر آیا ہے اور صحیح احادیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت کو جنت میں داخل کرنے کے بعد پکارے گا جنتی بلبل کہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا۔ "اب تم خوش ہو؟" وہ جواب دیں گے "پروردگار! کیا اب بھی ہم خوش نہ ہوں گے جب کہ تو نے یہاں ہمیں ہر طرح کی نعمتیں عطا کر رکھی ہیں۔" اللہ تعالیٰ فرمائے گا "کیا میں تمہیں ان سب نعمتوں سے بڑھ کر نعمت نہ عطا کروں؟" جنتی پوچھیں گے "اے پروردگار! ان نعمتوں سے افضل اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟" اللہ تعالیٰ فرمائے گا "اب میں تم پر اپنی رضا اور خوشنودی اتارتا ہوں اور آج کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔" (بخاری۔ کتاب التوحید۔ باب کلام الرب مع اہل الجنة)

سورہ النساء۔۔۔ آیت ۱۳۵

آیت۔۔۔ ۱۳۵

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوِّمِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ
إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ۚ وَإِنْ تَلَوْا أَوْ تَعْرَضُوا فَإِنَّ
اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٣٥﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار ¹⁶⁴ اور خدا واسطے کے گواہ بنو ¹⁶⁵ اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لہذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی پٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔

تفسیر تفہیم القرآن - مولانا مودودی

سُورَةُ النَّسَاءِ حَاشِيَةُ نَمْبَر: 164

یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو، بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علمبردار بنو۔ تمہارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا ہے۔ تمہیں اس بات پر کمر بستہ ہونا چاہیے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے تمہارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو۔

سُورَةُ النَّسَاءِ حَاشِيَةُ نَمْبَر: 165

یعنی تمہاری گواہی محض خدا کے لیے ہونی چاہیے، کسی کی رورعایت اس میں نہ ہو، کوئی ذاتی مفاد یا خدا کے سوا کسی کی خوشنودی تمہارے مد نظر نہ ہو۔

تفسیر فی ظلال القرآن - سید قطب شہید

سبق کا آغاز اس پکار سے کیا جاتا ہے جو جماعت مسلمہ کے نام ہے اسے کہا جاتا ہے کہ تم خیر امت ہو اور اس دنیا میں تمہارا ایک مقرر کردار ہے، اسے ادا کرنے کے لیے کمر باندھو اور دنیا میں عدل و انصاف کا وہ معیار قائم کرو جو انسانیت کی تاریخ کا سب سے اونچا معیار اور مثالی عدل ہو۔ اور عدل قائم کرنے میں تمہارا مطمح نظر اور نصب العین ذات باری کی رضا کا حصول ہو، اور اس معاملے میں کسی اور جذبے، کسی اور خواہش اور کسی اور مصلحت کو پیش نظر مت رکھو۔ اس معاملے میں خود اپنی جماعت، اپنی حکومت اور اپنی امت (Nation) کے مفادات کو بھی پیش نظر نہ رکھو۔ اس میں خدا ترسی اور رضائے الہی کے سوا تمہارے پیش نظر کوئی اور جذبہ نہ ہو۔ امت نے فی الواقعہ ایسا کیا اور اس کا ایک نمونہ ایک یہودی کے اوپر جھوٹے الزام کے واقعہ کی شکل میں خود قرآن کریم نے ریکارڈ کیا اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نبی کو بذریعہ وحی انصاف کرنے کی تنبیہ اور تاکید کی جس کا تذکرہ ہم تفصیلاً کر آئے ہیں۔

سبق کا آغاز اس حکم سے ہوتا ہے کہ عدل کرو، مطلق اور خالص عدل کرو۔ مطلق اور خالص عدل کس قدر مشکل کام ہے، اس کو رب کائنات ہی جانتا ہے۔ جس نے انسان کو پیدا کیا۔ رب کو معلوم ہے کہ اس راہ میں کیا کیا مشکلات پیش آتی ہیں۔ اللہ کو معلوم ہے کہ انسان میں کمزوری کے کیا کیا پہلو ہیں۔ انسان کے جذبات اس کی ذات کے لیے اور اقارب کے لیے کمزوروں اور زبردستوں کے لیے خصوصاً والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے، فقراء اور اغنیاء کے لیے، دوست اور دشمن کے لیے کیسے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے بیشتر جذبات اور یہ سب کے سب یا ان میں کوئی ایک بات عدل کے معاملے میں اثر انداز ہو سکتی ہے اور ان کو نظر انداز کرنا نہایت ہی مشکل کام ہے۔ یہ کام اسی طرح مشکل ہے جس طرح ایک آدمی نہایت ہی عمودی چڑھائی پر چڑھ رہا ہو اور اس میں اس کے پیش نظر صرف رضائے الہی اور جبل اللہ رہے۔ کس قدر مشکل ہے یہ کام۔

دوسری دعوت اس سبق میں یہ ہے کہ مکمل ایمان لے آؤ۔ اللہ کتابوں، ملائکہ، رسول اور یوم آخرت پر ایمان لاؤ۔ یہ ہے مکمل ایمان۔ اس کے تمام اجزاء کی اپنی اپنی جگہ بہت بڑی اہمیت ہے۔ یہ تمام اجزاء مل کر ایمان کو مکمل کرتے ہیں اور انہی اجزاء سے مجموعی اسلامی تصور حیات وجود میں آتا ہے، جو تمام دوسرے تصورات کے مقابلے میں زیادہ فوقیت رکھتا ہے، جو کسی زمانے میں انسانی معاشروں کے اندر رائج و معروف رہے ہیں۔ اسلام سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ یہ نظریہ حیات بذات خود، ہر نظریہ سے قوی اور برتر ہے اور اس سے تمام دوسری قدریں وجود میں آتی ہیں چاہے وہ اخلاقی ہوں، اجتماعی ہوں یا تنظیمی ہوں اور جن کا عملی مظاہرہ پہلی جماعت اسلامی کی زندگی میں ہوا تھا اور آئندہ کے ادوار میں بھی جس جماعت نے اس نظام پر صحیح طرح ایمان کا اظہار کیا اور اس کے تقاضوں کو پورا کیا تو اس کی زندگی کے اندر بھی یہی تفوق اور برتری پیدا ہوئی۔ قیامت تک یہ اصول اپنی جگہ قائم رہے گا اور قیامت میں تو بہر حال اللہ کا کلمہ ہی حق اور برتر ثابت ہوگا۔ یہ ہے مفہوم اس آیت کا (آیت) ”وَلَنَجْجِلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا“ (۴۱) (اللہ نے کافروں کے لیے مسلمانوں کے مقابلے میں برتری کی کوئی سبیل نہیں رکھی)۔

ان دود دعوتوں کے اب اللہ تعالیٰ منافقین پر تنقیدی حملہ شروع کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو ابھی تک اپنے نفاق کو چھپائے ہوئے ہیں اور بعض وہ ہیں جو منافق رہنے کے بعد دوبارہ کفر کا اعلان کر چکے ہیں۔ اس تنقیدی بیان میں منافقین کے مزاج ان کی قابل نفرت صورت، اسلامی صفوں کے اندر ان کی سرگرمیوں کی جو صورت حال ہے اس کی تفصیلات ان کا متلون موقف، کہ اگر مسلمانوں کو فتح ہو تو وہ ان کی چالپوسی کرتے ہیں اور اگر اہل کفر کو فتح نصیب ہو تو یہ ان کے ہاں بیٹھے ہوئے ہیں اور ہر جگہ خود اپنے آپ کو سبب فتح قرار دیتے ہیں۔ نماز کے لیے نہایت ہی بوجھل قدموں کے ساتھ جاتے ہیں۔ اور دکھاوے کے لیے پڑھتے ہیں، ان کا رویہ نہایت ہی مذہب ہوتا ہے۔ نہ ادھر کے اور نہ ادھر کے۔

اس تنقیدی حملے کے درمیان جا بجا اہل ایمان کو بھی ہدایات دی گئی ہیں جن سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ منافقین اس وقت اسلامی صفوں میں کس طرح گھسے ہوئے تھے اور کیا کیا کارستانیاں کر رہے تھے۔ اسلامی صفوں میں منافقین کو کس قدر اثر و رسوخ حاصل تھا۔ ان حالات میں اس قسم کے تنقیدی حملے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تاکہ اس وقت کے موجود حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے تحریک اسلامی کو قدم بقدم آگے بڑھایا جائے اور اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ منافقین سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جائیں اور ان کے ساتھ تعلقات رکھنے سے اجتناب کریں۔ ان کی مجالس میں نہ بیٹھیں،

جہاں وہ اکثر کفریہ گفتگوئیں کرتے ہیں اور اللہ کی آیات کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ البتہ اس دور میں قرآن کریم نے منافقین کے ساتھ بائیکاٹ کا حکم تو بہر حال نہیں دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ آیات نازل ہو رہی تھیں اس وقت منافقین کا جتھا بڑا مضبوط تھا اور وہ اس قدر سرگرم تھے کہ اہل اسلام کے لیے ان کا مکمل بائیکاٹ ممکن ہی نہ تھا۔

مسلمانوں کو اس تحذیر اور تنبیہ کرنے کے درمیان ہی یہ بتا دیا گیا کہ نفاق کی علامات کیا ہیں اور نفاق کا آغاز کس طرح شروع ہوتا ہے۔ تاکہ وہ خود بھی نفاق کی علامات سے اپنے آپ کو بچانے کی سعی کریں۔ سب سے پہلی ہدایت یہ دی جاتی ہے کہ تم منافقین کے ساتھ دوستی ہرگز نہ کرو اور منافقین کے ہاں اپنی عزت اور احترام بڑھانے کا لالچ نہ کرو، اس لیے کہ عزت تو صرف اللہ کے ہاں ہے۔ اللہ کو ہر گز یہ بات پسند نہیں کہ وہ کافروں کو اہل اسلام پر برتری دے اور منافقین تو دنیا و آخرت میں ذلیل ہوں گے۔ یہ ہے ان کی تصویر ذرا ملاحظہ کرو اور پھر آخرت میں وہ دوزخ کے اندر سب سے نیچے پڑے ہوں گے۔

اس انداز میں یہ ہدایات اور تنبیہات بتلائی ہیں کہ اسلامی نظام زندگی نفس انسانی اور اس کے اندر رچی بسی عادات کو کس طرح درست کرتا ہے اور کسی موجود عملی صورت حال کے اندر اسلام اصلاح کی کارروائی کا آغاز کس طرح کرتا ہے؟ اسلام نہایت ہی تدریج کے ساتھ کوئی تبدیلی لاتا ہے اور آخر کار کسی موجودہ صورت حال کو یکسر تبدیل کر کے اس کی جگہ نہایت ہی جدید صورت حالات لے کر آجائے ہے۔ نیز اس سے اس بات کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اس دور میں مسلمانوں کے حالات کیا تھے، کفر و نفاق کے محاذ ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح معاون تھے اور وہ کس طرح جماعت مسلمہ اور دین اسلام کے خلاف گٹھ جوڑ کئے ہوئے تھے۔

ان تمام تبصروں کے اندر غور کرنے سے یہ بات نظر آتی ہے کہ وہ کیا عظیم معرکہ تھا۔ جس کے اندر قرآن کریم نے جماعت مسلمہ کو ڈال دیا تھا۔ اور اس معرکہ میں ڈال کر قرآن کس نظام اور منہاج کے مطابق جماعت مسلمہ اور نفس انسانی کی قیادت اور راہنمائی کر رہا تھا۔ یہ معرکہ وہی معرکہ ہے جو ہر زمان و مکان کے اندر اسلام اور جاہلیت کے درمیان برپا رہا ہے اور کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔ وسائل بدل سکتے ہیں اور چہرے بدل سکتے ہیں لیکن اسلام اور جاہلیت کے درمیان جو جنگ ہے اس کی نوعیت آج بھی وہی ہے جو قرن اول میں تھی۔ نیز ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کی سرگرمیوں میں قرآن کریم کی قیادت اور راہنمائی کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ قرآن کریم یہ قیادت جس طرح حضور کے درمیان جو جنگ ہے اس کی نوعیت آج بھی وہی ہے جو قرن اول میں تھی۔ نیز ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کی سرگرمیوں میں قرآن کریم کی قیادت اور راہنمائی کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ قرآن کریم یہ قیادت جس طرح حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دور میں کرتا تھا، وہی راہنمائی اور قیادت وہ آج بھی کرتا ہے۔ قرآن کریم کسی ایک دور یا کسی ایک نسل کی راہنمائی کے لیے تو آیا ہی نہیں ہے، یہ تو اس امت کا قائدہ ہے، اس کا مرشد ہے اور اس کا ہادی ہے اور ہر دور اور ہر نسل کے لیے ہے۔

اور اس سبق کے آخر میں ایک لمحہ فکریہ! یہ کہ اللہ کو کیا پڑی ہے کہ وہ لوگوں کو خواہ مخواہ عذاب دے۔ اس کا مطالبہ تو صرف یہ ہے کہ ایمان لاؤ اور اللہ کا شکر بجالاؤ۔ اگر لوگ ایمان نہیں لاتے اور شکر گزار بندے نہیں بنتے تو اسے کوئی پروا نہیں۔ وہ تو ان کے ایمان اور شکر گزاری دونوں سے بے نیاز ہے۔ اللہ جو ہدایات دے رہا ہے وہ تو ان کی اصلاح کے لیے ہے۔ ان کو نرمی دینے کے لیے ہیں تاکہ وہ اس بات کے مستحق ہو جائیں کہ ان کو جنت میں انعامات ملیں۔ اگر وہ ان ہدایات کی خلاف ورزی کریں گے اور اٹھے پاؤں پھریں گے تو وہ خود عذاب جہنم کے مستحق ہو جائیں گے۔ اس میں صرف ان ہی کا ذاتی نقصان ہے اور منافقین تو اس جہنم کے بھی سب سے خطرناک ”درک اسفل“ میں ہوں گے، سب سے نیچے والے درجے ہیں۔

درس نمبر ۴۲ تشریح آیات:

۱۳۵۔۔ تا۔۔ ۱۴۷

(آیت) ”نمبر ۱۳۵۔

یہ اہل ایمان کو خصوصی پکار ہے۔ اس پکار میں ان کے لیے ایک جدید لقب اور ایک نئی صفت کو استعمال کیا گیا ہے اور اس لقب اور صفت میں وہ بالکل منفرد ہیں۔ اور الذین امنوا کی روح بدل گئی ہے۔ ان کے تصورات بالکل نئے ہو گئے ہیں۔ ان کے اصول اور مقاصد بدل کر نئے ہو گئے ہیں۔ وہ اس جدید

انقلابی مہم کے راہنما بن گئے ہیں اور ان کے کاندھوں پر عظیم ذمہ داریاں عائد کر دی گئی ہیں اب وہ پوری انسانیت کے لیے پاسبان و نگہبان ہیں۔ وہ لوگوں کے درمیان اب فیصلہ کرنے والے ہیں۔ اس لیے یہاں (آیت) ”یا ایھا الذین امنوا“ کے الفاظ نہایت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔ یعنی اس صفت ایمان ہی کی وجہ سے ان پر عالمی قیادت کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے اور پورے عالم کی قیادت کرنا گویا تقاضائے ایمان ہے اور صفت ایمان ہی کے تقاضے کے طور پر مسلمان اس قیادت کے مقام کا چارج لینے کے لیے یہ تیاری کر رہے تھے۔

اسلامی منہاج تربیت کی یہ ایک نہایت ہی موثر جھلکی ہے۔ اور امت مسلمہ کو ایک نہایت ہی بھاری ذمہ داری کا چارج دینے سے قبل ہی یہ جھلکی دکھائی گئی اور وہ بھاری ذمہ داری یہ ہے۔

(آیت) ”یا ایھا الذین امنوا کونوا قومین بالْقِسْطِ شَهِدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدِیْنَ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اُولٰٓئِیْ بِخَبْرٍ“ (۴ : ۱۳۵)

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو انصاف کے علمبردار اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے) یہ امانت اور ذمہ داری یہ تھی کہ تم نے عدل قائم کرنا ہے اور یہ عدل مطلق ہو گا جس کا علمبردار تم نے بننا ہے۔ ہر حال اور ہر میدان میں تم نے انصاف کرنا ہے۔ ایسا عدل جس کے ذریعے ظلم اور عدوان کی خود بخود نفی ہو جائے اور پورے کرہ ارض پر کہیں بھی ظلم نہ رہے اور یہ ایسا عدل ہو کہ ہر حقدار کو اس کا حق ملے۔ اس حق رسیدگی میں مومن اور غیر مومن دونوں برابر ہوں جیسا کہ یہودی کے قصے میں واضح طور پر کہا گیا ہے۔ اس میں رشتہ دار اور غیر رشتہ دار سب برابر ہوں۔ دوست اور دشمن سب برابر ہوں۔ غنی اور فقیر کا درجہ ایک ہی ہو۔

(آیت) ”(کونوا قومین بالْقِسْطِ شَهِدَاءَ لِلّٰهِ) (انصاف کے علمبردار اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو)

یہ انصاف اور شہادت صرف اللہ کے لیے ہو اور اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہو اور شہادت نہ ان کے لیے دی جائے جن کے حق میں دی جا رہی ہو اور نہ ان کی وجہ سے دی جائے جن کے خلاف دی جا رہی ہے۔ یہ شہادت نہ کسی فرد اور نہ کسی جماعت کے مفادات کے لیے ہو اور نہ شہادت ان حالات سے متاثر ہو کر دی جائے جو اس وقت موجود ہوں یا مقدمہ زیر بحث پر اثر انداز ہو رہے ہوں خالصتاً اللہ کے لیے اور خالصتاً اللہ کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے صرف اس کی رضا کے لیے دی جائے اور ایسے حالات میں کہ کوئی میلان، کوئی رجحان، کوئی مصلحت اور کوئی خواہش اسے متاثر نہ کر رہی ہو۔ نہ کسی کا لحاظ رکھا جا رہا ہو۔

(آیت) ”وَلَوْ عَلٰی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدِیْنَ وَالْاَقْرَبِیْنَ“ (۴ : ۱۳۵)

(اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔)

یہاں اسلامی نظام نفس انسانی کو خود اس کے اپنے خلاف مسلح کر رہا ہے۔ اپنے جذبات کے ساتھ اپنی ذات کے خلاف اپنے والدین کے خلاف اور اپنے رشتہ داروں کے خلاف اور یہ نہایت ہی دشوار مرحلہ ہے کہ کوئی اپنی ذات کے خلاف فیصلہ کرے۔ محض زبانی جمع خرچ تو آسان ہوتا ہے لیکن عملاً ایسا کرنا نہایت ہی مشکل ہوتا ہے۔ انسان ذہنی لحاظ سے اس کے بارے میں سوچ تو سکتا ہے کہ ایسا ہونا چاہیے مگر عمل دشوار ہوتا ہے اور اس بات کی اصل مشکلات کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب انسان عملاً یہ کام کرے۔ اس کے باوجود کہ یہ مشکل کام ہے اسلامی نظام نفس مومنہ کو تقویٰ کے ذریعے خود اپنی ذات کے خلاف مسلح کر رہا ہے کہ وہ اس خطرناک تجربے میں کود پڑے اس لیے کہ دنیا کے اندر عدل و انصاف کا یہی معیار ہونا چاہیے کہ کوئی اپنی ذات کے خلاف بھی فیصلہ کر گزرے اگر حق و انصاف اس کا تقاضا کرتے ہوں۔ اور کچھ لوگ یہ فیصلہ عملاً کر کے دکھائیں۔

اس کے بعد نفس انسانی کو اپنے فطری اور اجتماعی شعور کے خلاف بھی مسلح کیا جاتا ہے کہ جس شخص کے حق میں یا خلاف گواہی دی جا رہی ہو وہ غریب ہو۔ اگر وہ غریب ہے تو مشکل یہ ہوتی ہے کہ کوئی رحمدل انسان اس کے خلاف شہادت دینا گواہی دی جا رہی ہو وہ غریب ہو۔ اگر وہ غریب ہے تو مشکل یہ ہوتی ہے کہ کوئی رحمدل انسان اس کے خلاف شہادت دینا از روئے رحمدلی پسند نہیں کرتا اور یہ پسند کرتا ہے کہ اس کی کمزوری کی وجہ سے اس کے حق میں شہادت دے۔ یا کسی اجتماعی مرتبہ و مقام کی وجہ سے یا کسی سوسائٹی کی طبقاتی منافرت کی وجہ سے کوئی کسی زیر دست کے ساتھ نفرت کرتا ہو یا اگر مد مقابل گئی ہو تو اس کی وجاہت کا لحاظ رکھے اور اس کے خلاف شہادت نہ دے۔ جاہلیت کے تمام نظاموں میں ایسا ہوتا رہا ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے

کہ ایک گواہ ایک مالدار شخص کے ساتھ نفرت کرے اور اس کی مالداری اور برتری اسے پسند نہ ہو اور اس وجہ سے وہ شہادت حق نہ دے بلکہ مالدار کے خلاف شہادت دے دے۔ یہ تمام فطری میلانات ہوئے اور جب عمل کسی کو واسطہ پڑتا ہے تو انصاف اور شہادت کے وقت یہ اپنا وزن انسان پر ڈالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے تمام امور کو لے لیا کہ ذات ہو، اقرباء ہوں، غریب ہو یا امیر تم شہادت حق دو۔

(آیت) ”ان یکن غنیا و فقیرا اللہ اولیٰ بھما“۔ (۴ : ۱۳۵) (فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے) یہ نہایت ہی مشکل اور بھاری کام ہے۔ اسلام نے اہل ایمان کو عملی زندگی میں ڈالا اور اسے اس قدر بلندی تک پہنچایا کہ انھیں پوری انسانیت نے دیکھ لیا کہ اسلام نے اس کرہ ارض پر عالم انسانیت کے اندر یہ ایک عظیم معجزہ دکھایا تھا۔ یہ ایک ایسا معجزہ تھا کہ صرف اسلامی نظام کے سایہ ہی میں رونما ہو سکتا تھا۔

(آیت) ”فلا تتبعوا الھویٰ ان تعدلوا“۔ (۴ : ۱۳۵) (لہذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو) خواہشات نفسانیہ کی کئی اقسام ہوتی ہیں جن میں سے بعض کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ذات کی محبت، اہل و عیال کی محبت، رشتہ داروں کی محبت، کسی فقیر کے ساتھ رحمہلی، (شہادت کے وقت) کسی غنی کی رعایت اور وجاہت کا لحاظ، کسی امیر یا فقیر سے نفرت وغیرہ سب خواہشات نفسانیہ ہیں۔ خاندان، قبیلہ، قوم، وطن اور حکومت کی طرفداری (شہادت کے وقت) دشمن سے نفرت اگرچہ دین کے دشمن ہوں۔ غرض خواہشات کی بیشمار قسمیں اور رنگ ہیں۔ ان تمام خواہشات سے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے متاثر ہونے کو پسند نہیں کرتے۔ اور اس تاثر کے تحت انصاف اور شہادت حق سے باز رہنے سے منع کرتے ہیں۔ سب سے آخر میں اس بات پر متنبہ کیا جاتا ہے کہ شہادت کے اندر تحریف ہر گز نہ کرو اور شہادت سے منہ بھی نہ پھیرو۔

(آیت) ”وان تلوا و تعرضوا فان اللہ کان بما تعملون خبیرا“۔ (۴ : ۱۳۵) (اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔)

اس معاملے میں صرف یہ یاد دہائی کرائی جاتی ہے کہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے تاکہ اہل ایمان کے اندر یہ تاثر پختہ ہو جائے کہ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو اس کا انجام بہت ہی برا ہو گا تاکہ ان کا دل کانپ اٹھے اس لیے کہ قرآن کریم کی ان آیات کے مخاطب اہل ایمان ہی تو ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ جب عبد اللہ ابن رواحہ (رض) کو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خیر کی محصولات کی وصولی کے لیے بھیجا (یاد رہے کہ ان کے ساتھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نصف محصولات پر فیصلہ کیا تھا) اور وہ فتح خیبر کے بعد وہاں گئے تو یہودیوں نے ان کو اس امر کے لیے رشوت دینا چاہی کہ وہ ان کے ساتھ نرمی کریں تو انھوں نے یہودیوں سے کہا: ”خدا کی قسم میں تو ایک ایسے شخص کا نمائندہ ہوں جو اس پوری دنیا سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔ خدا کی قسم تم کو میں بندروں اور خنزیروں سے بھی زیادہ برا سمجھتا ہوں لیکن حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت اور تمہاری نفرت مجھے اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ میں تمہارے درمیان عدل کے سوا کچھ اور کروں۔“ اس پر یہودیوں نے کہا کہ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے زمین و آسمان کا نظام قائم ہے۔

عبد اللہ ابن رواحہ (رض) مدرسہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تعلیم یافتہ تھے، اور ان کی تعلیم و تربیت ربانی منہاج پر ہوئی تھی۔ وہ انسان تھے اور پورے انسانی جذبات کے ساتھ کسی عدالت کی کرسی پر بیٹھے اور کامیاب رہے۔ اور ان کے سوا دوسرے بھی کچھ کم نہ تھے جنھوں نے اسلامی نظام کے زیر سایہ معجزہ دنیا کو کر کے دکھایا۔

سالوں پر سال گزرتے رہے۔ صدیاں بیت گئیں اور یہ دور بہت دور چلا گیا ہے اور لائبریریاں فقہ اور قانون کی کتابوں سے بھر گئی ہیں۔ قانونی ضابطوں اور انصاف کے رولز ریگولیشن کی بہتات ہو گئی اور قانون اور انصاف کے محکمے اور وزارتیں تشکیل دے دی گئیں۔ اور دماغ عدل و انصاف کا نام سن سن کر پھر گئے۔ دنیا میں عدل کرنے کے بارے میں طویل ترین تقاریر اور مقالات پڑھے جانے لگے۔ عدل و انصاف کے سلسلے میں کئی نظریات پیدا ہوئے اور کئی تنظیمیں وجود میں آئیں اور کانفرنسیں ہوئیں لیکن وہ حقیقی عدل کہاں ہے؟ اس کا ذائقہ کسی نے نہیں چکھا۔ یہ عدل لوگوں کے ضمیروں اور ان کی زندگی میں عفتابی رہا۔ اور یہ عدل ان انتظامات کے باوجود اس اعلیٰ معیار تک نہ پہنچ سکا جو خیر القرون کا طرہ امتیاز تھا۔ اس کا حقیقی وجود اگر کہیں تھا تو صرف اسلامی نظام کے دور میں تھا۔ اس مختصر دور میں عدل کا گراف اس قدر بلندی تک پہنچا اور نبوت اور خلافت راشدہ کے بعد اگر وہ کہیں ملا تو صرف

اسلامی معاشرے کے اندر ملا اور صرف ان دلوں میں ملا جن میں اسلام جاگزین تھا اور ان افراد اور ان سوسائٹیوں میں ملا جن کی تربیت اسلامی نظام کے زیر سایہ ہو چکی تھی۔ جو یقیناً ایک واحد اور مثالی عادلانہ نظام ہے۔

وہ لوگ جو آج کل جدید سے جدید عدالتی نظام تشکیل دیتے ہیں، عدل و انصاف کے لیے جدید سے جدید ذرائع استعمال کرتے ہیں اور عدلیہ کے لیے نہایت ہی پیچیدہ طریقہ کار طے کرتے ہیں، ان لوگوں کو چاہیے کہ وہ ان امور کو بھی مد نظر رکھیں جو ہم نے اوپر دیئے ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ کار پیچیدہ ہے اور یہ نہایت ہی منظم عدالتی ڈھانچے اس سادہ اور نہایت ہی ابتدائی انتظامات سے زیادہ مفید ہوں گے جو اسلامی دور میں اختیار کئے گئے تھے۔ یہ جدید لوگ جن کے ہاتھوں میں عدلیہ کا اہتمام ہے، وہ سمجھتے ہوں گے کہ وہ بہت ہی کامیاب ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

یہ ایک وہم ہے اور یہ وہم اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ ظاہری حجم کو دیکھ کر حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ اشیاء کی حقیقت ان کے ظاہری حجم سے معلوم نہیں ہوتی۔ یہ اسلامی نظام ہی ہے جو ان سادہ حالات کے اندر اس قدر بلند معیار تک پہنچا اور آج بھی اسلام ہی ہے جو اس سطح تک عدل کے معیار کو پہنچا سکتا ہے، بشرطیکہ اسے اختیار کیا جائے۔

لیکن اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہم جدید ترقی یافتہ دور میں نظام عدالت کے جدید انتظامات اور ضابطہ ہائے دیوانی اور فوجداری سے فائدہ نہ اٹھائیں یا محکمہ انصاف کی جدید تنظیم اور ترقی یافتہ اشکال کو ختم کر کے ان کی جگہ خلافت راشہ کی سادہ شکل جاری کر دیں۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ اصل مقصد شکل اور تنظیم نہیں ہے بلکہ اصل مطلوب وہ روح ہے جو ظاہری شکل کے اندر کار فرما ہوتی ہے چاہے اس کی ظاہری شکل اور جسامت جو بھی ہو اور وہ نظام کیسے ہی خیالات اور کیسے ہی زمان و مکان میں ہو۔